31

قرب الٰہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں

(فرمودہ ۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء)

تشہد و تعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا۔

چونکہ تین چار دنوں سے نزلے کی وجہ سے حلق میں درد کی شکایت ہے۔ اس لئے میں بلند آواز سے ایسی آواز سے جو سب تک پہنچ سکے آج بول نہیں سکتا۔ اس لئے جن اصحاب کو جگہ مل سکے قریب آجائیں۔

مجھے جلسہ سالانہ کے منتظم کی طرف سے ایک رقعہ ملا تھا جس کو دو ہفتے کا عرصہ ہوا۔ اس میں جہاں یہ درخواست کی گئی تھی۔ کہ میں یہاں کے احباب کے پاس سفارش کروں کہ وہ جلسہ کے کاموں میں پورے طور پر مدد دیں۔ اور اپنی خدمات پیش کریں۔ وہاں ایک یہ بات بھی لکھی تھی کہ قادیان کے لوگوں نے جلسہ کی اعانت اور مدد کے لئے بہت سے وعدے کئے ہوئے ہیں۔ مگر بعض نے یا بہت نے ابھی تک پورے نہیں کئے۔ ان کو میں سفارش کروں کہ پورے کردیں۔ تاکہ جلسہ کے لئے جو سامان منگوانا ضروری ہے۔ منگوا لیا جائے۔ میں نے ایک ذاتی غرض اور ذاتی فائدہ کی وجہ سے اس امر کو اس وقت نہیں بیان کیا تھا۔ جب کہ جلسہ کی اعانت اور امداد کے لئے تحریک کی تھی۔ اور وہ ذاتی فائدہ اور غرض یہ تھی کہ میں نے بھی وعدہ کیا تھا۔ جو اس وقت تک پورا نہیں کیا تھا۔ اس لئے شرم آتی تھی۔ کہ میں دوسروں کو اس کے لئے کس طرح کہوں۔ جب تک خود نہ کروں۔ مگر اب چونکہ میں اپنا وعدہ پورا کر چکا ہوں۔ اس لئے وہ بات آپ لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ جو خود کر چکا ہوں۔ اس سے پہلے میں اس بات سے ڈرتا تھا۔ کہ **لم تقولون ما لا تفعلون** (الصف : ۳) جو بات خود نہیں کی اس کے متعلق آپ لوگوں کو کیا تحریک کروں۔ مگر اب چونکہ خدا نے مجھے توفیق دی ہے۔ اور میں اسے پورا کر چکا ہوں۔ اس لئے آپ لوگوں کو بھی کہتا ہوں۔ کہ وعدہ کو خدا تعالیٰ نے بہت قیمتی چیز قرار دیا ہے۔ اور وعدہ کا ایفاء بہت ضروری رکھا ہے۔[۱] اس لئے جنہوں نے وعدے کئے ہیں وہ پورا کریں۔

---

[۱] بنی اسرائیل : ۳۵

میں جانتا ہوں۔ کہ وعدہ کرنے کے وقت کئی آدمی ہمت اور طاقت سے زیادہ جرأت دکھاتے ہیں اور اگر ان کی نیت پورا کرنے کی ہوتی ہے۔ ریا کی غرض نہیں ہوتی۔ تو میں سمجھتا ہوں یہ بھی ایک نیکی ہے۔ گو اس سے ایک نقص بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ بار بار انسان وعدہ کرتا ہے۔ تو بار بار اسے پورا نہیں کر سکتا۔ اور جب بار بار پورا نہیں کر سکتا۔ تو وعدہ کی اہمیت اور قدر اس کے دل میں نہیں رہتی۔

ایسے حالات میں میں جانتا ہوں کہ ایسے بھی لوگ ہونگے جن کے لئے اب وعدہ پورا کرنا مشکل ہو گا۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اس غلطی کی اصلاح بھی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ وعدہ پورا کیا جائے۔ کیونکہ ایک دفعہ جب تکلیف اٹھا کر کوئی شخص وعدہ پورا کرے گا۔ تو دوسری دفعہ محتاط رہے گا کہ وہی وعدہ کروں جو پورا کر سکوں۔ پس میں ان لوگوں کو جنہوں نے جلسہ کے متعلق وعدے کئے ہیں یاد دلاتا ہوں کہ اپنے وعدے پورے کریں۔

میں منتظم صاحب سے اس بات میں متفق نہیں ہوں۔ کہ قادیان کے لوگ وعدہ کر کے اسے پورا کرنے میں سستی کرتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ قادیان کے لوگ چندوں کے وعدوں اور ان کے ایفا میں بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ جتنی جماعت قادیان میں ہے۔ اتنی اور کسی شہر میں نہیں ہے۔ یہاں قریباً اڑھائی ہزار احمدی ہیں۔ اتنی جماعت کس اور شہر میں نہیں ہے۔ اور کوئی قصبہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں اتنی جماعت اکٹھی ہو۔ اب کمزوروں کا اندازہ لگاتے وقت بھی اس تعداد کو مد نظر رکھنا چاہیئے۔ اگر کسی جگہ دو سو میں سے دس کمزوری دکھاتے ہیں۔ تو اسی نسبت سے یہاں سوا سو میں کمزوری ہو سکتی ہے۔ تو یہاں کی کثرت معیار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہاں آبادی کی تو کثرت ہے۔ کسی اور جگہ اگر ایک کمزور ہو۔ اور یہاں پر دس تو تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ جہاں ایک کمزور ہے۔ وہاں کل تعداد دس ہے۔ اور جہاں دس کمزور ہیں۔ وہاں کی تعداد اڑہائی ہزار ہے۔ پس اس نسبت سے دیکھنا چاہیئے۔ اور اس کے مطابق میں تو دیکھتا ہوں کہ یہاں کے لوگ ایثار اور قربانی میں دوسروں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہاں انہوں نے پہنچنا ہے۔ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ کیونکہ پچھلے ہفتوں میں انہوں نے دیکھ لیا ہے۔ جو میں ان کے متعلق خیال رکھتا ہوں۔ بات یہ ہے۔ کہ نہ تم اس مقام پر ابھی پہنچے ہو جہاں تمہیں پہنچنا چاہیئے۔ اور نہ میں نے وہ رستہ طے کر لیا ہے جو مجھے کرنا ہے۔ تمہارے آگے بھی اور میرے آگے بھی بہت وسیع رستہ ہے۔ جسے عبور کرنا ہے۔ اس لئے خوشی اور مسرت کا وہی موقع ہو گا۔ جب ہم اس جگہ پہنچ جائیں گے جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔ دیکھو ایک عیسائی ایک یہودی سے کم کافر ہے۔ مگر یہ اس کے لئے خوشی کا مقام نہیں۔ اسی طرح ایک ہندو ایک دہریہ

سے کم گنہگار ہے۔ مگر کیا وہ خوش ہونے کے قابل ہے۔ پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ منافق جہنم کے ادنیٰ درجہ میں ہونگے۔ کیا اوپر کے درجہ والا جہنمی خوش ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قادیان والوں کو جو نسبتی ترقی حاصل ہے۔ یہ خوشی کا موجب نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں مجھے دوسروں کے مقابلہ میں ان کے نسبتی درجہ سے انکار نہیں۔ وہاں اس سے بھی انکار نہیں۔ کہ ابھی ان کے سامنے بہت لمبا رستہ ہے جو عبور کرنا ہے۔ اور اسی کی طرف پچھلے خطبوں میں میں نے توجہ دلائی ہے۔

میں اس سلسلہ مضمون کو تو اس وقت بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ میرے حلق میں درد ہے۔ اس لئے زیادہ بول نہیں سکتا۔ البتہ خلاصتہ" سناتا ہوں کہ میرا مقصد اور مدعا ان خطبات سے کیا ہے۔

میں نے اب تک جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ یہاں جو لوگ آتے ہیں۔ دین کی خدمت کے لئے آتے ہیں۔ اور اشاعت اسلام کی غرض سے آتے ہیں۔ وہ خدمت خواہ دینی رنگ میں ہو۔ یا دنیاوی رنگ میں۔ مثلاً مسجد میں نماز کے لئے جو لوگ آتے ہیں۔ انہیں گرم پانی دینا یہ ایک کام ہے۔ مگر تم نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ کام کرنے والا دنیاوی کام کرتا ہے۔ جو کچھ وہ لاتا ہے۔ وہ پانی ہے۔ اور اس کا گرم کرنا بھی مادی کام ہے۔ پھر مسجد میں لاکر رکھنا بھی مادی کام ہے۔ پھر جس غرض کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نزلہ زکام نہ ہو۔ گویا صحت کے لئے۔ یہ بھی دنیاوی ہے۔ مگر پھر بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ دنیاوی کام ہے۔

صحابی جب لڑائی کے لئے جاتے تھے۔ تو تلوار ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ جسمانی چیز تھی۔ گھر بار بال بچے چھوڑ کر جاتے تھے۔ یہ بھی جسمانی چیزیں تھیں۔ اور جس چیز کے لئے لڑتے تھے۔ وہ بھی جسمانی تھی۔ ایمان نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کی جان تھی۔ اگر حضرت ابوبکرؓ مارے جاتے تو کیا انکا ایمان جاتا رہتا یا اگر حضرت عمرؓ مارے جاتے تو ان کا ایمان ضائع ہو جاتا؟ نہیں۔ لیکن ان کی جان چلی جاتی۔ کافر مسلمانوں کے ایمان کو چھین نہیں سکتے تھے۔ البتہ جانیں نکال سکتے تھے۔ کافر مسلمانوں کے گھروں' کھیتوں اور جسموں کو مٹانا چاہتے تھے۔ اور یہ سب چیزیں جسمانی تھیں۔ مگر کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحابہ سات آٹھ سال دنیاوی غرض کے لئے کفار سے لڑتے رہے۔ جنگ بدر اور احد کس بات کے لئے کی گئی۔ کیا اسی لئے نہیں کہ مسلمانوں کے گھر مسلمانوں کے کھیت' اور مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ اس سے زیادہ کفار اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ کیا وہ قرآن چھین کر لے جاسکتے تھے۔ یا ایمان اٹھا کر لے جا سکتے تھے۔ ان چیزوں کا لے لینا ان کی طاقت سے باہر تھا۔ اور گو جن چیزوں کی حفاظت کی جاتی تھی۔ وہ جسمانی تھیں۔ مگر ایمان پانی کی طرح ہے۔ اور جس طرح پانی برتن میں ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح ایمان مومنوں کے قلب میں ٹھہرتا ہے۔ اور مومنوں کا بچانا اگرچہ

جسمانی کام ہے۔ مگر یہ دین ہے۔ کیونکہ ایمان مومنین کے قلب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح یہاں کے کام جو بظاہر دنیاوی معلوم ہوتے ہیں دینی ہیں۔ مثلاً مدرسہ ہے۔ جس میں لڑکے اپنے فائدہ کے لئے علم پڑھتے ہیں۔ ہسپتال ہے لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح دوسرے کام ایک دنیاوی رنگ رکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ دنیاوی ہیں۔ کیونکہ ان کی غرض دین ہے۔ اور بالواسطہ دین کا اثر ڈالنا ہے۔ مثلاً مدرسہ میں جو تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں کہ لوگ دین حاصل کریں۔ مگر جب بچہ کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اسے اس لئے گھر سے جدا کر کے ایک ایسے گاؤں میں جو الگ تھلگ ہے چھوڑا گیا ہے کہ وہ دیندار بنے۔ تو یہی خیال بہت قیمتی ہے۔ پھر جب روزمرہ اس کی نظر ایسی جگہوں پر پڑتی ہے۔ جہاں خدا کا رسول اور مامور رہتا تھا۔ اور پھر جب وہ دیکھتا ہے۔ کہ وہ جگہ جو بالکل غیر آباد اور جنگل تھی۔ اس کے متعلق خدا کے فرستادہ نے جو یہ خبردی تھی۔ کہ دور تک آباد ہو جائے گی۔ پوری ہو رہی ہے۔ تو اس پر خاص اثر ہوتا ہے۔ پھر اس کے کان میں آواز آتی ہے۔ کہ تمام دنیا کے ساتھ اسلام کی جنگ شروع ہے۔ اور یہ آواز گھر میں اس شدت کے ساتھ وہ نہیں سن سکتا تھا۔ ان حالات میں اگر وہ ایک لفظ بھی دین کا نہیں سیکھتا۔ تو بھی ایک ایسی روح آہستہ آہستہ اس میں پیدا ہو رہی ہے۔ جو آج نہیں تو کل ضرور کام دے گی۔ لیکن اگر مدرسہ کو ہٹا دو۔ تو یہ روح ملیا میٹ ہو جائے گی۔ مگر یہ جو کچھ میں نے بتایا ہے۔ ادنیٰ حالت کو مدنظر رکھ کر بتایا ہے۔ ورنہ سکول میں دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ لڑکے درس سنتے ہیں۔ جب میں درس دیتا ہوں تو لڑکے میرا درس سنتے ہیں۔ اور اب میں نے اور کو مقرر کر دیا ہوا ہے۔ پھر مختلف لیکچر۔ خطبہ سنتے ہیں۔ اور دینی باتیں ان کے کانوں میں پڑتی رہتی ہیں۔

اسی طرح مدرسہ احمدیہ ہے۔ اس میں عربی' فلسفہ پڑھ لیا۔ اور بالواسطہ دین کی تعلیم بھی حاصل کرلی۔ لیکن اگر غرض ملازمت ہی ہو تو بھی اگر اس کام کو چھوڑ دیا جائے تو دین کی حفاظت کرنے والے کون ہونگے۔ ہو سکتا ہے۔ کہ عربی پڑھنے لکھنے۔ قرآن کا ترجمہ پڑھ لینے اور دوسرے علوم حاصل کر لینے کے بعد کوئی ملازمت کرلے۔ لیکن اگر اس جماعت کو مٹا دو۔ تو پھر کون دین کی حفاظت کرے گا کیونکہ ان ہی میں سے ایسے بھی نکلتے ہیں۔ جو دین کی خدمت کرتے ہیں۔ تو گویہ دنیاوی کام ہو مگر اصل میں دینی ہے۔

غرض یہاں کے جتنے کام ہیں سارے کے سارے حتیٰ کہ پہرے دینا۔ تجارت زراعت کرنا بھی دینی کام ہی ہے۔ کیونکہ ان کے نتیجہ میں بھی دین کی طاقت کو فائدہ پہنچتا ہے۔

پس دینی اور دنیوی کام میں اگر فرق کیا جا سکتا ہے تو اسی طرح کہ وہ کام ذاتی نہیں جس سے بلاواسطہ یا بالواسطہ اسلام کو فائدہ پہنچے۔ وہ دینی ہے۔ اور دنیوی وہ ہے جو صرف اپنی ذات سے تعلق

رکھتا ہو۔ اور دین پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے۔

میں نے بتایا تھا۔ کہ آپ لوگ دینی کام کے لئے یہاں آئے ہیں۔ اور سب کسی نہ کسی رنگ میں دینی کام کرتے ہیں۔ ورنہ اگر ان کاموں کو دینی نہ کہا جائے گا تو دین نماز روزہ ہی رہ جائے گا۔ یا سارا دن اور کام کرنے کے بعد اگر کسی کو تبلیغ کی جائے گی۔ تو وہ دینی کام ہوگا۔ مگر اصحاب الصفہؓ کی شمولیت اعلیٰ درجہ کی چیز سمجھی گئی ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ ان کی ہر گھڑی دینی کام میں صرف ہوتی ہے۔

پھر میں نے بتایا تھا۔ کہ جب ہمارے کام دینی کام ہیں۔ تو ملازمت اور نوکری کا کیا سوال۔ جب خدا اور رسول کے لئے۔ اور اسی کے جانشینوں کی مدد کرنے کے لئے اور **اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامرمنکم** (النساء ۶۰) کی تینوں شقوں کو پورا کرنے کے لئے یعنی خدا اور رسول اور تم میں جو اولی الامر ہو اس کے احکام بجالانے کے لئے جمع ہوئے ہو تو پھر ملازمت کیسی۔ اور ایسے اہم اور ضروری کام کو ملازموں کے سپرد کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

پھر میں نے بتایا تھا۔ کہ اس مقصد کو پورا کرو۔ میری اس تعلیم کی غرض کیا ہے۔ کیا محض یہ کہ شورش اور بے اطمینانی مٹ جائے۔ نہیں۔ کیونکہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں اور نہ مجھے اس کی وجہ سے گھبراہٹ ہے۔ روپیہ میرے پاس نہیں آتا۔ خرچ میں نہیں کرتا۔ میرا تو یہی ہے کہ ہاتھ جھاڑ کر الگ رہوں۔ روپیہ اگر میرے پاس آتا اور میں خرچ کرتا تو مجھے فکر ہوتی۔ کہ مجھ سے پوچھیں گے کہاں ہے۔ مگر نہ روپیہ میرے پاس آئے نہ میں حساب رکھوں۔ پس اس وجہ سے جو لڑائی جھگڑا ہوگا تمہارا آپس کا ہوگا۔ اگر میں یقین اور وثوق سے یہ نہ سمجھوں کہ یہ باتیں خدا تعالیٰ سے بُعد کی علامت ہیں تو مجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف اس لئے فکر ہے کہ اس طرح وہ غرض مٹ جائے گی جس کے لئے تم لوگ یہاں آئے ہو۔ اور جس کے لئے خدا تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے۔ ہمارا پیدا کرنا اور انبیاء کا آنا اس کے اندر ایک غرض ہے۔ اور وہ یہی کہ ہم ایسی تبدیلی پیدا کریں۔ کہ خدا تعالیٰ کا قرب اور وصال حاصل ہو جائے۔ اس قرب اور وصال کے حاصل ہونے کے رستہ میں جو روکیں ہیں۔ ان سے چونکہ ہمارا تعلق ہے۔ اور وہ روکیں ہمیں متفکر کر دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان باتوں سے میں متفکر ہوتا ہوں۔ ورنہ ذاتی طور پر میری اس میں کوئی غرض نہیں۔ پس خدا تعالیٰ کا قرب اور وصال حاصل کرنا ہی وہ غرض ہے۔ جس کے لئے تم لوگ یہاں آئے ہو۔ اور اس کے لئے خدا نے سب کو پیدا کیا ہے۔

اوروں میں اور تم میں فرق یہ ہے کہ تم نے اس غرض کو سمجھ لیا ہے۔ اور انہوں نے نہیں سمجھا۔ دنیا میں تین گروہ ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے سمجھا ہی نہیں کہ خدا تعالیٰ نے انہیں اس غرض

کے لئے پیدا کیا ہے یا وہ سمجھتے ہیں خدا ہی نہیں۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو سمجھتا ہے کہ اس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے مگرانہیں اس کے حاصل کرنے کے ذرائع میں ہم سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ جو تم کہتے ہو وہ نہیں۔ بلکہ اور ہیں۔ انہوں نے غلط ذرائع سمجھ رکھے ہیں۔ اور تیسرا گروہ وہ ہے۔ جسے معلوم ہے۔ کہ اس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے جو صحیح ذرائع ہیں۔ وہ بھی اسے معلوم ہیں۔ اور وہ تم ہو جو اس گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ ابتدائی شرائط کو تم نے پورا کر لیا۔ اور انتہائی شرائط کے پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم نے اپنی پیدائش کی غرض کو سمجھ لیا ہے۔ وصال الی اللہ کے صحیح ذرائع بھی سمجھ لئے ہیں۔ اور اب تیسری شق باقی ہے۔ کہ اگر انسان کوشش کرے۔ تو قرب الی اللہ حاصل کر سکتا ہے۔

گویا اب تم اس مقام پر پہنچ گئے ہو کہ ذرا پردہ ہٹے اور تم اپنے محبوب کا چہرہ دیکھ لو۔ ایسے وقت میں اگر تم کسی اور بات میں مشغول ہو جاؤ۔ تو کیسے افسوس کی بات ہوگی۔ اور وہ جو تمہیں گھیر گھار کر ایسے موقع پر لانے والا ہے۔ اس کو فکر ہوگی یا نہیں۔ دیکھو ایک شخص جو اپنے محبوب سے بچھڑا ہوا ہو۔ اسے ایک شخص کئی سال کی محنت و مشقت سے جب تلاش کر کے لائے۔ اور محبوب کے دروازہ پر کھڑا کر دے۔ لیکن وہ بجائے اندر جانے کے ایک بین بجائے والے کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جو پاس ہی سانپ نکال رہا ہو۔ تو لانے والے کو کسی قدر صدمہ اور افسوس ہوگا۔ اور اس شخص کی حالت بھی کیسی قابل افسوس ہوگی۔

اس طرح اگر دس بیس سال کی محنت کے بعد ایک کو قائم مقام بنا کر کہا جائے۔ کہ لو اب تم کام کرو۔ مگر وہ بجائے اس کام کو کرنے کے کسی اور شغل میں لگ جائے۔ تو کام سپرد کرنے والے کو کس قدر صدمہ ہوگا۔ وہ لوگ جنہوں نے سیدھا اور سچا رستہ پا لیا ہے۔ وہ اگر اس کو دیکھ کر اور سمجھ کر اور باتوں میں لگ جائیں تو ان کی مثال ایسی ہی ہوگی۔ جیسے ایک شخص نے بہت اعلیٰ درجہ کی عمارت بنائی ہو۔ اور اپنی بیوی بچوں کو اس میں لے جانے والا ہو۔ لیکن زلزلہ آئے اور ساری عمارت کو پاش پاش کر جائے۔ تو میرے فکر کی یہ وجہ ہے۔

اور میں اس ذمہ داری کو سمجھ کر آپ لوگوں کو نصیحت کرتا ہوں۔ کہ اپنا قدم دنیا کی بجائے دین کی طرف بڑھاؤ۔ یہ ممکن نہیں کہ تم دنیا کو بالکل چھوڑ دو۔ اور سب کاموں سے علیحدہ ہو جاؤ۔ مگر تمہیں دنیا کے بیچ رہ کر اس سے علیحدہ ہونا ہے۔ حافظ صاحب نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق ایک شعر کہا ہے۔ گو اسے اپنے اوپر چسپاں کیا ہے۔ مگر یہ اولیاء اللہ کا طریق ہے کہ وہ اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں۔ مگر مراد اس سے حافظ نہیں۔ بلکہ اور لوگ ہیں۔ کہتے ہیں ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ

باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

یعنی ایسی جگہوں اور ایسے مقامات میں رکھ کر جہاں دنیاوی ابتلاؤں اور کشمکشوں سے انسان بچ نہیں سکتا۔ کہا گیا ہے کہ گنہگار نہ بنو۔ یہ ایسا سوال ہے۔ جو ہر دنیا دار کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ یا تو کہو کہ بیوی بچوں کو چھوڑ دو۔ نہ یہ ہونگے اور نہ ان کے کھانے پینے اور پہننے کی فکر ہوگی۔ تم یہ جو کہتے ہو کہ ان کے کھانے پینے کی فکر نہ کرو۔ کیا بیوی کو طلاق دے دیں بچے پیدا ہی نہ کریں یا بچوں کو گھر سے نکال دیں یا انکو چھوڑ چھاڑ کر نکل جائیں؟ مگر آگے حکم ہے۔ ایسا بھی نہ کرو۔ بیوی بچوں میں ہی رہو۔ اور انکو کھانے پینے کے لئے دو۔ اور اولاد پیدا ہونے سے روکنا سوائے اس صورت کہ بیوی کی جان کا خطرہ ہو بہت بڑا گناہ کرنا ہے۔ پھر کریں تو کیا کریں۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ کھانے والے تو لاؤ۔ مگر کماؤ نہیں بظاہر یہ بات بہت عجیب نظر آتی ہے۔ مگر یہی وہ معمہ ہے جس کے حل کرنے سے انسان کا قدم ادھر اٹھ سکتا ہے جدھر چلنے سے خدا ملتا ہے۔

جب تک انسان ایسی بھٹی میں نہیں پڑتا۔ اس وقت تک کس طرح سمجھتا ہے کہ واقع میں اس نے کوئی قربانی کی ہے۔ یہی باتیں ہیں۔ جن کے حل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قربانی کیا ہے۔ قربانی کے معنی قریب کر دینے والے کے ہیں۔ اور قریب انسان اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب اس بھٹی میں سے گذرتا ہے۔ ایک طرف اسے کہا جاتا ہے۔ کسی قسم کا لالچ اور حرص نہ کر۔ اور دوسری طرف کہا جاتا ہے۔ بیوی بچوں کو پال۔ ایک طرف کہا جاتا ہے۔ دنیاوی باتوں کی طرف توجہ نہ کر۔ اور دوسری طرف کہا جاتا ہے۔ اپنا اور اپنے لواحقین کی ضروریات کا انتظام کر۔ بظاہر یہ ایک ایسی مشکل ہے کہ جس کا حل نظر نہیں آتا۔

پھر اس کے حل کا کیا طریق ہونا چاہیئے؟ وہی جو حضرت ابراہیمؑ نے اختیار کیا کہ وہ بظاہر آگ میں کودے۔ مگر دیکھا کہ وہ آگ نہیں بلکہ گلزار تھا۔ جب انسان خدا پر توکل کر کے کودتا ہے۔ تو گو اس وقت معلوم نہیں ہوتا کہ کیا ہوگا۔ اور ایسا خیال کرتا ہے کہ اس مشکل کا حل ہی نہیں۔ مگر کودنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ایسی آسان اور سادہ بات ہے کہ اس کے متعلق حل کا لفظ ہی استعمال کرنا بے وقوفی ہے۔ جیسا کہ جب سورج چڑھا ہوا ہو تو یہ کہنا کہ بتاؤ سورج کہاں ہے بے وقوفی ہے۔ پس اس وقت اس میں اخفا ہی نہیں رہتا یعنی یہ حالت جب انسان پر گزرتی ہے۔ اور جب وہ دین اور دنیا کے دونوں رستوں کے اندر سے گزرتا ہے جو خدا تعالیٰ نے بنائے ہیں۔ تب خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے سامان پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ ہیں وہ قربانیاں جو قرب الی اللہ کے لئے ضروری ہیں۔

تم یہ مت خیال کرو۔ کہ تم میں کمزوریاں ہیں۔ اور تم بہت سے گناہوں سے نہیں بچ سکتے۔

جب سب گناہوں سے بچ جائیں گے اور ساری کمزوریاں دور ہو جائیں گی تب ہم خدا کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ شیطان کے دھوکے اور وسوسے ہیں۔ کوئی گناہ اور کوئی کمزوری خدا کے قرب سے نہیں روک سکتی۔ گناہ اور کمزوریاں چلتے چلتے اس طرح جھڑتی جاتی ہیں جس طرح ایک آدمی چلتا جاتا ہے اور اس کی جوتی سے کانٹے جھڑتے جاتے ہیں جس طرح مضبوط کپڑے کا کوٹ پہن کر کانٹوں میں سے گذرنے والا جب کسی کانٹے سے اٹکتا ہے تو ٹھہرتا نہیں۔ بلکہ جھٹکا دیکر چھڑا لیتا ہے۔ اور آگے روانہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمہارے کاندھوں پر بھی دین کا کوٹ ہے۔ اور تم اس قسم کی رکاوٹوں سے ٹھہرو نہیں بلکہ انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے گذرتے جاؤ۔ یہ چیزیں تمہارے راستہ میں روک نہ ہوں۔ اور تم اس فکر میں مت پڑو کہ ان کو ہٹالیں تو پھر آگے بڑھیں گے۔ اگر تم اس کے ہٹانے میں لگے رہو گے تو اسی میں رہ جاؤ گے۔ دیکھا گیا ہے۔ ایک کانٹا لگنے پر اگر اسے ٹھہر کر ہٹانے لگیں تو دوسرا لگ جاتا ہے۔ لیکن اگر بغیر ٹھہرے جھٹکا دے دیا جائے تو آسانی سے چھٹکارا ہو جاتا ہے۔ پس ان روکوں کی فکر میں مت رہو۔ یہ خود گرتی اور ہٹتی جائیں گی۔

تمہارا کام یہ ہے کہ قرب الی اللہ کے لئے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے جاؤ۔ نمازوں میں روزوں میں۔ ایک دوسرے سے سلوک میں' معاملہ کرنے کرانے میں' قرضہ لینے اور دینے میں' بات چیت میں افسر یا ماتحت ہونے کی حالت میں' بیوی بچوں کے معاملہ میں غرضیکہ ہر بات میں یہی غرض تمہارے مدنظر ہونی چاہیے۔ کہ قرب الی اللہ حاصل ہو۔ اگر تم سے کوئی غلطی ہوتی ہے۔ کوئی کمزوری سرزد ہوتی ہے۔ کوئی نقص واقع ہوتا ہے تو یہ نہیں کہ اس مقصد کو چھوڑ دو۔ بلکہ اور زیادہ کوشش کرو۔ جس طرح ایک لکھنے والا پہلے خراب لکھتا ہے۔ لیکن بار بار لکھنے سے اچھا لکھنے لگ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر تم بھی مستقل رہو گے۔ تو سب نقص دور ہو جائیں گے۔

پس تم اپنی کسی کمزوری کی طرف مت دیکھو۔ بہت لمبے رستہ تک کمزوریاں ساتھ جاتی ہیں۔ ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ اور ہاتھ آگے ہی آگے بڑھانا چاہیے۔ اگر کسی بات میں کمزوری ہو تو اسے پھر کرو۔ پھر کرو۔ پھر کرو حتیٰ کہ تمہیں خوب مشق ہو جائے۔ اور جب مشق ہو جائے گی۔ تو اس کے کرنے میں کوئی روک نہ پیش آئے گی لیکن اگر تم یہ کہو کہ کمزوری دور کر کے پھر اسے کرنا شروع کریں گے۔ تو پھر نہیں کر سکو گے۔ اصل مقصد کو تمہیں مدنظر رکھنا چاہیئے۔ کانٹے مدنظر نہیں ہونا چاہئیں۔ ان کو نکالنے نہ بیٹھ جاؤ۔ بلکہ ان کو دور کرو۔ جس طرح راستہ چلتا ہوا مسافر جھٹکا دیکر اپنا دامن چھڑا لیتا ہے اور اس مقام پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ کہ جہاں پہنچ کر انسان ابتلاؤں سے بچ جاتا ہے۔ اور جہاں یہ خطرہ نہیں رہتا کہ وہ غلط راستہ پر ہے۔ اعمال میں کمزوری ہو تو ہو۔ مگر یہ ایسی حالت ہوگی جیسے ایک بیمار اچھا تو ہو گیا۔ مگر کمزوری کی وجہ سے اس کا قدم صحیح طور پر نہ پڑتا ہو۔

دیکھو نمونیہ یا محرقہ کی بیماری ہے۔ محرقہ پہلے تھوڑا ہوتا ہے مگر جس کو ہوگا ڈاکٹر اسے دیکھ کر کانپ جائے گا۔ کہ نہ معلوم اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن جب محرقہ انتہا کو پہنچنے کے بعد کم ہو جاتا ہے۔ تو وہی ڈاکٹر جو پہلے دن ۹۹درجہ پر خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ وہی اب ۱۰۲درجہ پر خوش ہوگا۔ اس پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس دن تو وہ ۹۹درجہ پر گھبراتا تھا مگر آج پندرہ دن کے بعد ۱۰۲درجہ پر خوش ہو رہا ہے تو بیوقوف ہوگا۔ کیونکہ اس دن وہ ۹۹درجہ میں ترقی کی روح دیکھتا تھا اس لئے گھبراتا تھا۔ اور اب ۱۰۲درجہ میں تنزل کے آثار دیکھتا ہے۔ اس لئے خوش ہے۔ پس جب قدم آگے کو بڑھ رہا ہو اور دیکھے کہ قرب الی اللہ کی طرف جا رہا ہے۔ تو کمزوریاں خواہ کیسی ہی ہوں۔ ان کی پرواہ نہ کرے لیکن اگر دیکھے کہ وہ کوئی گناہ نہیں کرتا۔ مگر خدا کے قرب کی طرف اس کا قدم نہیں جا رہا۔ اس کے دل میں قرب الی اللہ کے لئے کوئی تڑپ نہیں تو وہ سمجھ لے کہ اس کی محرقہ بخار چڑھنے کی حالت ہے۔ جو سخت خطرناک ہے۔

پس تم اپنے ہر کام ہر فعل اور ہر بات میں اس اصل کو مدنظر رکھو۔ رات دن تمہارے دل میں ایک ہی خواہش ہو کہ تم دنیا میں رہ کر خدا سے جا ملو۔ دنیا کے علوم اور دنیا کی ترقیات تمہیں اپنی طرف نہ کھینچیں۔ میں حیران رہ جاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ بڑے بڑے عالم ہوتے ہیں۔ مگر ان کو دنیا اپنی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔ لالچ مال میں ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ علم میں بھی ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کی تباہی کا باعث یہ علم کا لالچ بھی ہوا ہے انہیں علم کلام کی حرص پیدا ہوئی۔ دوسروں کو فلسفہ میں باتیں کرتے دیکھ کر علم کلام بنایا۔ اور اسلام کا ستیاناس کر دیا کیونکہ انہوں نے پیشاب کو دودھ میں ملا دیا۔

بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی طرف کھینچنے والی جو چیزیں ہیں۔ ان کی طرف جب متوجہ ہو جاتا ہے۔ تو اصل مقصد اور مدعا کے پانے سے رہ جاتا ہے۔ لیکن جب اس میں یہ روح پیدا ہو جائے کہ ان باتوں کی طرف توجہ نہ کرے۔ تو پھر خواہ کتنی روکیں اس کے راستہ میں آئیں۔ ان سے نکل جائے گا۔ اور اسے کوئی نقصان نہ ہوگا۔

پس یہ خواہش اپنے اندر پیدا کرو۔ کہ خدا تعالیٰ کو پانا ہے اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے۔ دنیا کے مال، دنیا کے فوائد، دنیا کے منافع تمہاری نظر میں کچھ حقیقت نہ رکھتے ہوں۔ اگر یہ صورت ہو۔ تو خواہ تم میں لاکھ کمزوری ہو کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ اگر سارے نہیں تو تم میں سے ایک جماعت ضرور منزل مقصود پر پہنچ جائے گی۔ لیکن اگر یہ نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ خواہ تم کیسے دعوے کرنے والے اور کیسی باتیں بنانے والے ہو۔ کیا مسلمانوں میں مسیح موعودؑ سے پہلے ایسے لوگ نہیں تھے؟ انہوں نے کیا بنا لیا اور وہ کیا کر سکے؟

میں اس روح کو لفظوں میں تمہارے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مگر جب پکڑنے اور بیان کرنے لگتا ہوں۔ تو رہ جاتا ہوں۔ اور بیان نہیں کر سکتا۔ یہ روح ذہنی طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور جب پیدا ہو جائے تب ہی اس کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ لفظوں میں اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح میٹھی میٹھی درد ہوتی ہے اور ہاتھ لگانے سے معلوم نہیں ہو سکتا کہ کہاں ہوتی ہے۔ اسی طرح اس روح کا بھی پتہ نہیں لگایا جا سکتا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ اسے پکڑ کر تمہارے سامنے رکھ دوں۔ اور تم اس کو معلوم کر کے اسے اپنے اندر پیدا کرلو۔ مگر کیا کروں وہ پکڑی نہیں جاتی۔ میں نے اس بات پر بڑا غور۔ فکر اور تدبر کیا ہے کہ اس روح کی حقیقت بتا اور سمجھا سکوں۔ مگر مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لئے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ایسی چیز ہے کہ کوئی انسان کسی کو نہیں دے سکتا۔ صرف خدا ہی دے سکتا ہے اور خدا ہی انسان کے اندر یہ بات پیدا کر سکتا ہے۔ جس طرح بینائی کوئی انسان کسی کو نہیں دے سکتا۔ ہاں اشاروں سے ایک اندھے کو سمجھا سکتا ہے کہ بینائی ایسی چیز ہوتی ہے، جس کے ذریعہ بغیر آواز کے انسان دوسرے کو پہچان لیتا ہے۔ اب اگر اسے یک لخت یہ بات حاصل ہو جائے تو وہ سمجھ لے گا۔ کہ مجھے بینائی مل گئی ہے۔ اسی طرح اس کے متعلق بھی میں صرف اشارے ہی کر سکتا ہوں۔ اصل حقیقت نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ یہ بات قلب سے تعلق رکھتی ہے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ تم میں سے ایسے لوگ ہونگے جن پر دین کی بنیاد رکھی جائے گی۔ مگر میں یہ بھی کہنے سے نہیں رک سکتا۔ کہ میں دیکھتا ہوں تمہارے عالموں میں نئے علوم سے تعصب اور انگریزی خوانوں میں نیچریت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ جب تک ظاہری علوم پڑھنے والے قدرت خاص اور قدرت عام کا اعتراف نہ کریں اور دل سے اعتراف نہ کریں۔ اس وقت تک دین نہیں آسکتا۔

اگرچہ ابھی تک واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن اگر کبھی پڑے تو ہمارے ایسے مولوی ہیں۔ کہ جب کوئی نیا علم ان کے سامنے آئے۔ تو وہ اس کا انکار کر دیں۔ (یہ نہیں کہ خدا کے دین کے ماتحت اس کو لے آئیں) جیسا کہ پادریوں نے کیا۔ جب سچی باتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھے۔ اور اس طرح لوگوں کے دلوں سے ان کی وقعت اٹھ گئی۔ تو پھر وہی باتیں بھی ان کے مقابلہ میں پیش کر کے لوگوں سے منوالی گئیں۔ اسی طرح اگر کوئی موقع آجائے۔ تو یہ علماء انکار کر دیں گے۔ اور ان کے مقابلہ میں ایسے بھی ہیں جو معجزات کا انکار کر دیں گے۔ اور اگر انکار نہ کریں گے۔ تو ایسے معجزے جیسے چھینٹے پڑنے کا ہے۔ پیش کرتے ہوئے جھجکیں گے۔ اور اگر پیش کر دیں گے تو ان کے دل میں یہ خواہش نہ پیدا ہوگی کہ ہم پر بھی چھینٹے پڑیں۔ اور یہ مخفی علامت ہے نیچریت کی۔ ورنہ وہ کیوں خواہش نہ کریں۔ کہ ہمارے لئے بھی خدا تعالیٰ قدرت خاص جاری کرے۔

میرے نزدیک یہ سخت کمزوریاں ہیں۔ قرب الی اللہ کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس مقام پر پہنچ جائے۔ جہاں وہ خدا تعالیٰ کی قدرت خاص کا مشاہدہ کر سکے۔ جو بھی بات اس کے ماتحت ظاہر ہو۔ اس کا انکار نہ کرے۔ دیکھو سورج چاند کے مقابلہ میں نہیں چمکتا۔ لیکن اگر ایسا موقع آجائے کہ سورج بھی چمک رہا ہو اور چاند بھی۔ تو عقلمند اسی کو کہا جائے گا جو یہ کہے گا کہ میں چاند کو بھی چمکتا دیکھ رہا ہوں اور سورج کو بھی۔ مگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ پہلے تجربہ کے خلاف ہے مگر ہے ٹھیک۔

پس میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہ تمہیں ایسا ایمان حاصل ہو کہ دنیاوی روکیں تمہارے راستہ سے مٹ جائیں۔ اور تمہارے ایمان کی بنیاد رویت پر ہو۔ تمہارے اندر قرب الی اللہ کی خواہش ہو۔ اور تمہارے سب کام اسی خواہش کے نیچے ہوں۔ جو نہ تو اسے ہٹا سکیں۔ اور نہ اس کے ماتحت کام کرنے سے ہٹا سکیں۔

یہ بات اگر تم میں پیدا ہو جائے تو تمہیں وہ درجہ حاصل ہو سکتا ہے جو مشاہدہ کا درجہ ہے۔ اور ایسی جماعت کے لئے پھر کوئی گھبراہٹ نہیں ہوگی۔ کہ ٹھوکر کھا جائیں گے۔ حضرت معین الدین چشتی۔ حضرت شہاب الدین سہروردی اور دوسرے بزرگوں نے دین کی بڑی خدمت کی ہے۔ ان کے مقابلہ میں امام ابو حنیفہؒ ،امام شافعیؒ ،امام مالکؒ ،امام حنبلؒ ،اور ائمہ جو گذرے ہیں۔ یہ سب اہل اللہ تھے۔ اور ان سب کا روحانیت سے تعلق تھا۔ گو انہوں نے علم کی مختلف شاخیں تقسیم کر لی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری جماعت میں بھی ایسے ہی لوگ پیدا ہوں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی چاہتا ہوں۔ اور پچھلوں کی غلطی سے فائدہ اٹھاتا ہوں جو یہ ہے کہ ہماری جماعت میں جنید بغدادی اور ابن عربی و معین الدین چشتی جیسے لوگ تو ہوں۔ مگر باتیں اس رنگ میں نہ کریں جس رنگ میں انہوں نے اپنے وقت میں کسی وجہ سے کی تھیں۔ کیونکہ ان باتوں سے لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ پس ایسے لوگ ہوں تو سہی اور میں امید رکھتا ہوں کہ ہونگے۔ اور اب بھی ایسے ہیں۔ جن میں خدا تعالیٰ نے اس مقام پر پہنچنے کا مادہ رکھا ہے۔ مگر میں نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنے الفاظ کو ظاہر شریعت کے ماتحت رکھیں۔ تاکہ لوگ ٹھوکر نہ کھائیں۔

یہ غرض ہے میرے ان خطبوں کی کہ تمہیں قرب الی اللہ کا ایسا درجہ حاصل ہو جائے جس سے دنیا کی کوئی چیز تمہیں ہٹا نہ سکے۔

(الفضل ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۱ء)